© rasailojaraid.com

لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

مجیب الرحمٰن۔ لاہور

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اس ٹھٹھرتے موسم میں بیس تیس آدمیوں کا ایک قافلہ اونٹوں پر سامان لادے کسی منزل کی تلاش میں تھا۔ مقامی زبان میں ان لوگوں کو "بھڑشے" کہا جاتا تھا اور رات کو کہیں پڑ کر سو رہتے تھے۔ روٹی سالن مل گیا تو بہتر ورنہ گڑ وغیرہ سے کام چلا کر وقت گذارتے تھے۔۔۔۔۔۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ لیکن انہیں کوئی ڈیرہ یا منزل نظر نہیں آ رہی تھی۔ اندھیرے کی شدت سے لگتا تھا۔ جیسے رات کالی بلا کی طرح منہ کھولے کھڑی ہو۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ قافلے کے آدمیوں نے مجبوراً نہر کے پاس واقع چند گھروں میں سے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ لیکن ان لوگوں نے کسی قسم کے تعاون سے انکار کر دیا۔ اور انہیں مانی خان کی جھوک (بستی) جانے کا مشورہ دیا۔ یہ قافلہ گرتا پڑتا مانی خان کی جھوک پہنچا اور فیض خان کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ اور اپنی حاجت سے آگاہ کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فیض خان نے فوراً اپنی بیوی اور بھابھی کو جگایا اور کھانا تیار کرایا انہیں کھانا کھلایا اور رہنے کے لئے جگہ دی۔

آج سے کوئی ڈیڑھ سو سال قبل مانی خان جو ایک سیال قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ نے جھنگ سے ہجرت کر کے مظفر گڑھ کے شمال میں دریائے چناب کے مغربی کنارے پر ڈیرہ ڈالا۔ فیض خان اسی مانی خان کی اولاد میں سے تھا۔ سخاوت اسکی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی غریبوں سے اس کا رویہ مشفقانہ اور جاگیرداروں سے جارحانہ ہوتا تھا۔ اس علاقے کے جاگیردار انسانوں سے زیادہ کتوں سے محبت کرتے تھے۔ یہ مزارعوں کے خون جگر سے سینچی ہوئی فصلوں کا پھل کھاتے اور پھر چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر انہیں ایسی ایسی سزائیں دیتے کہ انسانیت پامال ہو کے رہ جاتی یہ لوگ غلہ اور اناج کے ذخیرے کر لیتے اور یوں اجناس کے بھاؤ چڑھا کر انسانوں کی قیمت گراتے۔ بعض دفعہ تو ان جاگیرداروں کا جبر یہاں تک بڑھ جاتا کہ یہ مجبور روبے کس لوگ جسموں کی تجارت پر مجبور ہو جاتے۔ کنواری بیٹیوں کو پیٹ پالنے کا ذریعہ بناتے۔ اور یوں جینے کی خواہش اور زندگی کی تمنا کے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان کرتے۔ ہائے بیچارے کسان! یہ کہانی تب بھی تھی اور اب بھی ہے۔ کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ لیکن فیض خان نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ کہ اسے موچی، کمہار اور جلاہے قسم کے کمی کمین لوگ بھی پیارے لگتے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرتا۔ کوئی بے گھر شخص کسی جاگیردار کا ستایا ہوا آتا۔ تو اسے فوراً زمین دے دیتا۔ اور بڑے زور سے کہتا کہ یہ زمین خدا کی ہے اور سب کی سانجھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ بہت لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس ہزاروں بیگھہ زمین ہوتی ہے اور ہاتھ میں تسبیح اور ببانگ دہل اعلان کر رہے ہوتے ہیں۔ کہ صاحب! اس دنیا کی کیا حیثیت ہے۔ یہ دنیا تو چار روزہ ہے۔ یہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے۔ لیکن اس فانی دنیا میں سے یہ صاحب مزارع اس کا حق نہیں دے سکتے۔ اس فانی دنیا میں سے زمین اپنی بیٹی اور بہن کے نام نہیں کر سکتے اس فانی دنیا میں سے زکوٰۃ نہیں دے سکتے اور اس فانی دنیا کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بہت سے پیر، پنڈت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ملا بھی ایسے ہیں۔ جو لوگوں کو نور دنیا کے وعظ سناتے ہیں اور خود مال و زر کے ذخیرے جمع کرتے ہیں۔ بات بہت دور چلی گئی۔ لیکن کیا کیجیئے کہ " بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بغیر "

فیض خان اس علاقے میں روشنی کا ایک مینار تھا۔ جو ظلمت کدوں میں لوگوں کو روشنی دکھاتا ہے۔ اسکے ڈیرے پر تیس تیس مہمان تو معمول کی بات تھی۔ لیکن اگر کبھی یہ تعداد ساٹھ تک بھی پہنچ جاتی تو بھی اسکے ماتھے پر بل نہ آتا۔ نہ جانے اس نے یہ سبق کون سے مکتب اور کون سی یونیورسٹی سے پڑھا تھا۔ کہ ہر انسان اپنا ہی رزق کھاتا ہے۔ کھلانے والا تو محض ایک ذریعہ ہے۔

یہ فیضانِ نظر تھا۔ یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

آج جبکہ دنیا (GIVE AND TAKE) لو اور دو کے اصول پر عمل کر رہی ہے۔ اس سبق کو دہرانے اور رٹانے کی ضرورت ہے۔ آج کوئی چیز دی اسلئے جاتی ہے کہ دوسرے سے دو گنی وصول ہوسکے۔ رشتہ دار اگر غریب ہے تو کھانا کھاؤ گے؟ اور امیر ہے تو کھانا حاضر کر دیا جاتا ہے۔
پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی جاتی۔ بیچارے غریب کو بھی خواہی نخواہی کہنا ہی پڑتا ہے کہ نہیں صاحب میں تو کھا کے آیا ہوں۔

کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

فیض خان آج اس دنیا میں نہیں ہے لیکن لوگ اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اسے یاد کرتے ہیں۔ غریبوں کے سامنے اس کا نام لو تو رو دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

" لکھ مرے۔ لکھ پال نہ مرے "

(لاکھوں مر جائیں! لیکن وہ شخص جو لاکھوں کا کفیل ہے وہ نہ مرے)

فیض خان زندہ ہے لوگوں کے دلوں میں۔ اس نے عمر بھر انسانوں سے محبت کی۔ انسانوں سے پیار کیا اور کچھ بعید نہیں کہ اسی سے اس کی بخشش ہو گئی ہو۔

داورِ محشر مجھے تیری قسم!
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے

تو میرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

مانی خان کی جھوک کے ساتھ ایک اور تاریخی بستی ہے جسے ٹھٹھہ سیال کہا جاتا ہے یہاں بھی سیال قبیلے آباد ہیں جھنگ سے آنے والے تمام سیال قبیلے سنی العقیدہ تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شیعہ ہونے لگے۔ شاید یہاں کے سارے قبیلے شیعہ ہو جاتے۔ لیکن ایک خاتون نے اپنا تن من دھن لگا کر اس طوفان کا مقابلہ کیا۔ ان کا نام سردار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاتون تھا۔ ان کی تقریباً پانچ سو بیگھہ زمین تھی۔ عین جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ چنانچہ باقی زندگی خدمت دین کے لئے وقف کر دی۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے، اسی مضراب سے

سردار خاتون پورے علاقہ میں مائی صاحب کے نام سے مشہور تھیں۔ خاوند کی وفات کے بعد انہوں نے ایک مسجد اور مدرسہ بنوایا۔ اس مدرسہ کو بنے ہوئے قریباً اسی (۸۰) سال ہو گئے ہیں۔ سب سے پہلے مدرس حضرت مولانا عزیز اللہ تھے۔ یہ علاقہ نادر پور کے رہنے والے تھے۔ اور نہایت عبادت گذار، ملنسار، تہجد گذار اور شفیق انسان تھے۔ دوسرے علمائ جو یہاں پڑھاتے رہے۔ ان میں مولانا غلام محمد صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب، اور مولانا خدا بخش صاحب شامل تھے۔ آخرالذکر بعد میں مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے تھے اور وہیں مدفون ہیں۔

یہاں سے بلا مبالغہ بیسیوں علماء نے فیض حاصل کیا، اور جامپور، ڈیرہ غازی خان، جتوئی، علی پور، شہر سلطان اور رحیم یار خان کے علاقوں میں دین کی تعلیم، ترویج کے لئے کام کیا۔ میرے والد گرامی مولانا عبدالرحمن رحمتہ اللہ علیہ سابق خطیب کوٹلہ رحم علی شاہ (یہ وہ تاریخی بستی ہے۔ جہاں مولانا عبیداللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ تبلیغ اور علم حاصل کرتے رہے۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی ذاتی ڈائری میں بھی کیا ہے) بھی ابتداء میں یہیں سے فیض حاصل کرتے رہے۔ شاید مولانا عزیز اللہ صاحب اور مائی صاحب کی تربیت کا اثر تھا۔ کہ انہوں نے کبھی تہجد، اشراق، چاشت اور اوابین قضاء نہ کی۔ صرف مرض الموت میں ان کا ناغہ ہوا ورنہ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ پندرہ پارے یومیہ پڑھنا ان کا معمول رہا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے خصوصی تعلق رہا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو "خادم امیر شریعت" اور "رفیق امیر شریعت" نہ کہا۔ آج کل ایسے بیسیوں "خادم خاص امیر شریعت" پیدا ہو چکے ہیں جن کا کوئی ایک عمل بھی امیر شریعت جیسا نہیں، لیکن یہ لوگ ان لاحقوں اور سابقوں سے اپنا کاروبار چمکاتے ہیں زر اور زمین کے پیروں میں پڑتے ہیں۔ ساری زندگی ریل اور جیل میں گذارنے والے کا نام لیکر لاکھوں روپے کی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ لکڑ، پتھر اور "ککڑ" ہضم کر جاتے ہیں اور پھر ڈکار مار کر بھاری بھرکم آواز میں "الحمدللہ" سے اپنی تقریروں کا آغاز کرتے ہیں۔

سادہ لوح عوام کو ورغلاتے ہیں۔ اور یوں دنیا و آخرت دونوں کی "بھلائی" کے حقدار بنتے ہیں۔۔۔۔

وذلک ھو الفوزالمبین!!

خیر! کبھی وقت ملا تو دل کے پھپھولوں کو پھوڑ کر یہ بتائیں گے کہ اپنے ہی گھر کو آگ لگانے میں گھر کے چراغوں کا کتنا دخل ہے۔

"مائی صاحبہ" کی ایک اہم صفت یہ تھی کہ وہ مدرسہ کے تیس چالیس طلباء کا کھانا خود پکایا کرتی تھیں رات کو تہجد کے وقت اٹھتیں پانی گرم کرتیں تاکہ طلباء گرم پانی سے وضو کر سکیں طلباء کے لئے تین چار قسم کے کھانے پکتے۔ "مائی صاحبہ" ہر طالب علم کے پاس جاتیں اور اس سے پوچھتیں کہ بیٹا کسی چیز کی کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟ یوں اپنے حسن سلوک سے ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دیتیں اور طلباء یوں محسوس کرتے جیسے اپنے گھر میں ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آجکل کے مہتمم حضرات کو حضرت مائی صاحبہ کا یہ کردار اپنانے کی ضرورت ہے۔ جو چندہ دینے والے امرا تو بڑی گرمجوشی سے معانقہ کرتے ہیں۔ چہرے پر ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے ہوتے ہیں، چاہے اگلا سمگلر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن غریب طلباء کے لئے چار انگلیاں (یہاں انگوٹھا بھی بند کرلیا جاتا ہے) جن کی تقریبات میں امراء تو محفل کی زینت بنے ہوتے ہیں۔ لیکن غریب طلباء کے لئے علیحدہ کھانا بھیج دیا جاتا ہے۔

"مائی صاحبہ" کو فوت ہوئے ۳۵ برس ہونے کو آئے۔ لیکن علاقہ میں ان کا نام آج بھی زندہ ہے۔ پچھلی سردیوں میں، میں ٹھٹھہ سیال گیا تو میں مائی صاحبہ کے پوتے (حقیقی نہیں) جو تقریباً ۷۵ برس کے ہو چکے ہیں سے ملنا چاہتا تھا۔ پتہ چلا کہ حافظ صاحب چناب کے پار کسی کام سے گئے ہوئے ہیں، میں بستی میں انتظار کرنے کی بجائے وہیں چلا گیا۔ حافظ صاحب نے دیسی انڈوں اور چائے سے خاطر مدارات کی کہ

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

میں ان سے "مائی صاحبہ" اور مدرسہ کے متعلق کچھ معلومات لینا چاہتا تھا۔ ان کی یادداشت نے بہت کم ان کا ساتھ دیا۔ پرانے ساتھیوں اور بھولی بسری یادوں کو تازہ کرتے ہوئے آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اور آواز نے ساتھ دینے سے انکار کردیا۔

دل فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور اٹھا
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی

کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے . نہ وہ جلسے نہ شہر رعنائی

"مولانا احتشام الحق تھانوی کی آپ بیتی

مولانا احتشام الحق تھانوی کی یہ آپ بیتی ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۰ء کی تحریک جمہوریت پاکستان کے زمانے کی آپ بیتی اور اسلام پسندوں کے قافلہ۔ اتحاد اسلامی کے انتشار اور اس کے پس منظر کی چشم دید بیانیہ ہے جسے مولانا تھانوی کی زبانی ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے مرتب کیا ہے۔ مولانا تھانوی مرحوم نے اس کا نام "اسلام پسندوں کے انتشار میں جماعت اسلامی کا حصہ" رکھا تھا، لیکن مرتب نے اسے "مولانا احتشام الحق تھانوی کی آپ بیتی --- تحریک جمہوریت پاکستان کا ایک باب" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ "چند۔ ضمیمہ جات" پر مشتمل ہے جسے شاہد حسین خان نے مرتب کیا ہے۔ اس میں تحریک پاکستان کے زمانے سے لے کر بعد تک جماعت اسلامی کے سیاسی افکار کو مرتب کر دیا گیا ہے اور جماعت اسلامی کے سیاسی و مذہبی افکار و عقائد اور کردار کے ان پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے، جن کی طرف مولانا تھانوی نے اپنی آپ بیتی میں اشارہ کیا تھا۔ یہ کتاب مولانا احتشام الحق تھانوی اکادمی کراچی نے شائع کی ہے۔

© rasailojaraid.com